بلوچستان کی دو افسانہ نگار۔ رفعت زیبا اور امرت مراد کی تحریروں کا تقابلی جائزہ

شمیم کوثر

Shamim Kausar

Associate Professor, Department of Urdu,

Govt. Girls Degree College, Jinnah Town, Quetta.

Abstract

In Blochistan less prose work is done rather than poem writing.Before the creation of Pakistan up to date, none of the female name is found. After the creation of Pakistan till the exise period a lot of short stories have been written. Two women, Riffat Zeba and Amrat Morad are slected here from these writers in the area from the era 1980-2016.

پاکستان کے بلوچی علاقے میں افسانہ اردو کے علاوہ مقامی زبانوں میں لکھا جاتا ہے اور پھر انہیں اردو میں منتقل کرنے کا عمل ترجمے کی صورت میں جاری ہے۔ افسانہ مختصر کہانی کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ یہ ہمارے ادب میں اصناف نثر میں سب سے اہم صنف مانی جاتی ہے۔ وہ اس لئے کہ لکھاری اور قاری دونوں ہی اس سے مختصر وقت میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی پہچان ان کے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔ کسی بھی ادبی نشست میں سنایا جا سکتا ہے اور اخبارات و رسائل میں پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اسی لئے ناول کی طوالت کے سامنے اس مختصر صنف کو پذیرائی نصیب ہوئی۔ یہاں پر قیام پاکستان سے پہلے اور بعد ۲۰۰۰ء کی دہائی تک یوسف عزیز مگسی کے تحریر کردہ افسانے کو پہلا اردو افسانہ مانا گیا۔ اس بات کا تذکرہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب ''بلوچستان میں اردو ۱۹۶۸ء''، ڈاکٹر فاروق احمد کی کتاب ''بلوچستان میں اردو زبان و ادب ۱۹۹۸ء'' محترمہ مبارکہ حمید کے ایم فل مقالہ میں آچکا ہے۔ ڈاکٹر فاروق احمد کے مطابق:

''با قاعدہ طبع زاد افسانہ نگار یوسف عزیز مگسی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔''(۱)

اردو ادب کی خوش قسمتی یہ ٹھہری کہ اسے ماہر تعلیم، شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار اور محقق ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن کی کھوج نصیب ہوئی۔ صحیح شخص کی دریافت نے تحقیق کو مکمل کر دیا۔ انہوں نے پورے وثوق و ثبوت کے ساتھ اس تحقیق کو رد کر دیا۔ محقق ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ ''ایک راز سر کا

انکشاف یا غیبی امداد'' افسانہ ہے۔جس کی اشاعت ہفت روزہ ''البلوچ'' میں ۷ مئی ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔اس طرح یہ بلوچستان میں لکھا جانے والا پہلا اردو افسانہ اور دوسرا افسانہ یوسف عزیز مگسی کا ۱۹۳۴ء میں شائع ہونے والا ''تکمیل انسانیت'' ہے۔یوں افسانے کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔اس کے بعد افسانے کی روایت آگے بڑھتی رہی اور قیام پاکستان سے اب تک اس صنف میں ہزار ہا افسانے لکھے گئے جبکہ کئی مجموعات چھپے۔ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے تحقیقی کتاب ''اردو افسانے کے رجحانات'' شائع کرائی ۔ایم۔فل کی سندی تحقیق کا مقالہ مسز مبارکہ حمید نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سندی تحقیق کے سلسلے میں جامعہ بلوچستان میں ڈاکٹر خالد محمود خٹک کی زیر نگرانی اور ایس بی کے وومنز یونیورسٹی میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن کے زیر نگرانی شعبہ اردو میں اردو افسانے پر تحقیق مختلف موضوعات کے تحت ایم۔فل اور ایم۔اے کی سطح پر ہو رہی ہے اور کچھ مکمل ہو چکی ہے۔اس وقت ہم یہاں کی دو افسانہ نگار خواتین کا تذکرہ کریں گے جو شاعرات بھی ہیں۔ان میں سے ایک کا تعلق ساٹھ سے ستر کی دہائی اور دوسری کا جدید دور ۲۰۱٦ء سے ہے۔

رفعت زیبا (۱۹٦۳ء۔۲۰۱۰ء) آپ نے لورالائی میں جنم لیا۔آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چاند کا زہر'' ۱۹۷۳ء میں اور دوسرا ''میرے زخم بکتے ہیں'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔اس دہائی میں کسی خاتون کے شائع ہونے والے مجموعے یہاں کی اردو نثری تاریخ میں اہم ہیں۔وہ ایک شاعرہ، ناول نگار ،افسانہ نگار،صحافی ،ٹی وی اور ریڈیو کی جانی پہچانی آواز تھی۔ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ہم صلاحیتوں کی بجائے ذاتی تعلقات،ہم زبان ہونا اور جان پہچان والوں کو اولیت دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے اکثر بے پناہ صلاحیتوں کے حامل لوگ دب کر رہ جاتے ہیں۔وہ ریڈیو پاکستان کے حوالے سے اپنا خیال ظاہر کرتی ہیں:

> ''میری شہرت کا پہلا زینہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے شروع ہوا۔اگر صفیہ ملک مجھے اصرار کر کے ریڈیو نہ لے جاتیں تو شاید آج میں گمنامی کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ پاکستان کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی پروگرام کئے اور جب لندن جانا ہوا تو بی بی سی لندن سے سپیشل بلوچستان کا پروگرام ریکارڈ کرایا۔''(۲)

مجموعہ ''میرے زخم بکتے ہیں'' میں افسانوں کے علاوہ اشعار اور یادگار تصاویر بھی ہیں جو ان کی بیٹی رضوانہ (ہالینڈ) کی فوٹو گرافی ہے۔انہوں نے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں لکھنا شروع کیا اور ان موضوعات پر لکھا جنہیں اجاگر کرنا یہاں کی روایتی نظام میں اتنا آسان نہ تھا۔اس وقت خواتین کو اتنی آزادی نہ تھی جس قدر آج میسر ہے۔یوں کہیے کہ خواتین کے لئے راستہ بنانے والی خواتین میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔ان کے موضوعات حقیقت کے عکاس ہیں۔وہ کھری بات کہنے میں بالکل نہیں جھجکتیں۔اس معاشرے میں جب کوئی جھوٹ کے خلاف سچ بولے یا معاشرتی بیماریوں کے خلاف آواز

بلند کرے تو اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے معاشرتی تلخیوں کو موضوع بنایا اور سماج کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ خوف کو بالائے طاق رکھ کر لکھا۔ انہوں نے اس درد کو محسوس کیا جسے محسوس تو سب کرتے تھے لیکن لفظوں کا جامہ پہنانے سے خوفزدہ تھے۔ ایسے میں ایک لکھاری خاتون کے قلم نے آواز اٹھائی۔ کوثر زمرد کا خیال ہے:

> ''ان کی کہانیاں ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کی حساسیت کی عکاسی کرتے ہوئے تخلیقی آسودگی کا سبب بنتی ہیں۔ ان کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ بیمار ذہنوں کے ہجوم میں زندہ رہیں۔ بے مہر لوگوں نے ان پر سنگ زنی کا بہت فراخ دلانہ رویہ سدا رکھا اور وہ خون رگ جاں کرتی ہوئی باتوں کو گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اک چپ کے ساتھ بڑی ہمت سے جیتی رہیں۔ وہ لوگوں کے جگر سوز رویوں سے گزرتے گزرتے ''میرے زخم بکتے ہیں'' تک آتی ہیں۔ کہانی پر ان کی گرفت قاری کو پھسلنے نہیں دیتی اور یہ خوبی شاذ کسی کے حصے میں آتی ہے۔'' (۳)

ان کے موضوعات زندگی کے دکھ و غم، لوگوں کے برے رویے اور محبتوں کے امین ہیں۔ عورت کو مظلوم ٹھہرانا اور اسے مظلومیت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا اچھی بات نہیں بلکہ اسے اپنے حقوق سے آگاہ کرنا اور پھر حقوق کو پورا کرنے کے لئے مضبوط بن کر ظالم کے سامنے ڈٹ جانا ہی جیت ہے اور یہی رویہ آپ کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کے ساتھ ساتھ الفاظ کا چناؤ بھی بہترین رہا ہے۔ ان کے الفاظ تحریر کو بھاری پن کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ حکیم بلوچ نے اس افسانے کے بارے میں لکھا ہے:

> ''میں نے وصال کو پڑھا۔ تو وصال کے مرحلوں اور لذت کی شادکامی کو ادھورا چہرہ کی کہانی سے جوڑنے کی کوشش کی تو یوں لگا کہ زن نغمہ گر و عشق شعار کے لئے نہ سہی، مگر زن مرد گرہ جنس شعار کے لئے اس خرابے میں مردوں کی کوئی کمی نہیں۔ الٹرا ماڈرن سوسائٹی میں پلی اوپری طبقے کی الہڑ جوان جنس پرستی کی شکار اخلاقی وسماجی اقدار سے تہی دامن لا ابالی رنگین اپنی جوانی کے مہکتے پھولوں کو چار سو پھیلا کر اپنے جسم سے ہمکنار کر کے رنج خمار کو مٹانے نکلتی ہے۔ مگر تشنہ لبی کی جان گسل کیفیت سے نکل کر بھی سیرابی چشمہ جاں تک نہیں پہنچ پاتی۔۔ کہ وہ اپنے آپ کو تخلیق کے کرب سے دور رکھ کر ادھورے پن میں دوجے پن کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہے۔ اور وہ خوش قسمت مرد طشتری میں رکھ کر دیے ہوئے کردار کو بھی نبھا نہیں سکتا۔'' (۴)

ان کے موضوع زیادہ تر مرد کے تلخ اور سخت رویوں کے گرد گھومتے ہیں۔اس کی بیوفائی، ظلم، ناانصافی اورعورت کے حقوق کی بات تو کرتی ہے لیکن مرد کے رشتے اور مقام سے انکار نہیں کرتے۔اس کے برعکس عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو سامنے لاتی ہیں۔وہ اس دور میں ان رویوں کا شکار رہی ہے۔ ماں باپ نے جہاں شادی کی وہ چپ چاپ اسی دہلیز پر جیسے تیسے زندگی گزار دیتی ہے۔حالات کی چکی میں چپ چاپ پس جانا، جائیداد کے حق سے محروم رکھنا، فرسودہ رسومات کے بھینٹ چڑھانا، شادی کے حق سے محروم رکھنا، عورت بے قصور ہونے کے باوجود زندگی کے دکھوں میں اپنا وجود کھو دیتی ہے۔انہوں نے ان معاشرتی رویوں کے خلاف قلم اٹھایا تو کسی کو بھی یہ منظور نہ تھا کہ ان کی روایات یا فرسودہ رسموں کی پامالی ہو۔اس وقت کا تقاضا تھا اور ان کے اس رویے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہو لیکن آج ان کی آواز نے ماحول کو کسی حد تک آسودگی بخش دی ہے۔انہوں نے جدید افسانے کی بنیاد رکھی اور ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جن پر کوئی لکھنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے رائے دی: ''کہا جاتا ہے کہ نیا افسانہ اب نہیں رہا مگر اس لفظ نئے کے معنوں کا تعین کون کرے گا؟

> ''رفعت زیبا کا یہ حسن قلم ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں جیتی جاگتی زندگی اور اپنی عملی حیات کے ساتھ رشتہ جوڑتی نظر آتی ہیں میرے نزدیک ہماری راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل ہے وہ اثبات کا خوف ہے اور ہم اس سے اس لئے خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہم اپنے سائے سے ڈرتے ہیں۔اس نے اس سائے کو پہچان لیا ہے شاید اسی لئے روشنی کا ہر دروازہ ان کی دہلیز پر آ کر کھلتا ہے۔''(۵)

مصنفہ کی شخصیت کے کئی پہلو ان تحریروں میں جلوہ گر ہیں۔وہ بھی ایسے ہی حالات کا شکار رہیں۔مصنف جتنا بھی چاہے لیکن تحریر اور اس کے الفاظ اس کی شخصیت کی عکاسی ضرور کرتے ہیں۔وہ دو بچیوں (روبینہ، رضوانہ) کی ماں تھی اس نے تنہا ان کی پرورش کر کے ان کو نا صرف تعلیم کے زیور سے نوازا بلکہ باعزت زندگی کے حوالے کیا۔وہ ذاتی زندگی میں بے حد سادہ، روایتی قسم کی گفت وشنید کرنے والی خاتون تھی۔وہ رومانیت، احساسیت، جذباتیت، اور محبت کے پہلوؤں میں جذبوں کی شدت کو تلاش کرتی نظر آتی ہے۔زندگی کا روکھا پن ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔انہوں نے کئی افسانے لکھے لیکن زیادہ پسند کئے جانے والوں میں سے ''چاند کا زہر، دوسرا مرد، دل دریا سمندروں ڈونگھے، جب مجھے قتل کیا گیا، گریز'' ہیں۔افسانہ ''جب مجھے قتل کیا گیا'' کی تصویر کشی عمدہ مثال ہے۔اسے پڑھتے ہوئے اور ختم کر کے قاری سوچتا ہے کہ یہ افسانہ تھا یا حقیقی واقعہ۔افسانے میں جان ڈالنا اور اسے زندگی کے قریب لانا کے فن سے مصنفہ واقف تھیں۔ان کے کردار قاری سے باتیں کرتے ہیں۔وہ جاندار کرداروں کو منتخب کرتی ہیں۔کہانی کو مکالمے آگے بڑھاتے ہیں۔وہ شستہ اور اعتدال میں رہتے ہوئے مکالمے لکھتی ہیں۔جن میں طوالت کا عنصر نہیں۔بات سے بات نکلتی ہے۔ڈاکٹر فاروق احمد کے مطابق:

''رفعت زیبا پچھلی تین دہائیوں سے ناول اور افسانے پر کام کر رہی ہیں۔''چاند کا زہر، ریشماں، سیماب، خوابوں کے آبگینے'' ان کی اہم تصنیفات شمار کی جاسکتی ہیں۔''(٦)

یہاں کے لکھاری جب اپنی تحریروں کو قلمبند کرتے ہیں تو کوئی ایک ایسے ہیں جو یہاں کے قدرتی مناظر کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ یہاں کی سرزمین سرسبز و شاداب ہے اور خشک پہاڑوں کے حصار میں بھی ہے۔ یہاں گنگناتے چشمے، پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ، موسم گرما میں جنت النظیر موسم اور سرما میں برفیلی ہوائیں ہیں۔ان مناظر کو رفعت زیبا نے بھی اپنے کلام و اسلوب میں برتا ہے۔وہ بھی ان مناظر سے بہت متاثر تھیں۔ جب وہ ان منظر کو بیان کرتی ہیں تو افسانے کا بھاری پن ختم ہو جاتا ہے اور ہلکا پھلکا تاثر ابھرتا ہے۔مسز مبارکہ حمید لکھتی ہیں:

''ان کے ہاں قدرتی مناظر اور انسانی حسن کا بیان افسانے کو شاعرانہ اسلوب بیان عطا کرتا ہے اور پھر اس میں رومانیت کا اتنا زیادہ غلبہ ہے کہ قاری اس میں پڑھتے وقت گم ہو جاتا ہے۔ان کے نظریات اور خیالات سادہ اور زندگی کے عمومی رخ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں مردوں کے ظلم کا اظہار ملتا ہے۔''(۷)

وہ مصنفہ کے ساتھ شاعرہ بھی تھیں۔شاعری میں جدت کی قائل تھیں۔ان کی ملاقات عبیداللہ علیم، منیر نیازی، سحر انصاری، سلیم احمد، حمایت علی شاعر، دلیپ کمار، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، نور جہاں اور واجدہ تبسم (انڈیا) سے ہوئی۔شاعری کے حوالے سے بات کریں تو کوثر زمرد حسین لکھتے ہیں:

''وہ ایک کامیاب صحافی اور اعلیٰ پائے کی شاعرہ بھی ہیں۔گو کہ وہ مشاعروں میں بہت کم پڑھتی ہیں تاہم ایک ذاتی نشست میں ان کی نظم ''وصال'' ان سے سنی ۔ بلاشبہ یہ نظم دل کے گداز گوشوں کو چھوتی ہے۔''(۸)

ان کے افسانے کسی من گھڑت کہانی کا نتیجہ نہیں۔ان کو پڑھ کر مصنفہ کی سوانح حیات مرتب کرنا مشکل نہیں۔ یہ سب وہ ہی کر سکتا ہے جو اپنی ذات میں انجمن اور اعتماد کا مالک ہو۔آپ نے انہی صلاحیتوں کو مرکوز کر کے افسانوں کا تانا بانا بنا۔کہانی میں جھول نہیں نہ ہی کہیں دلچسپی اور تجسس ختم ہوا اور یہی بات انہیں بہترین افسانہ نگاروں میں شامل کرتی ہے۔افضل مراد لکھتے ہیں:

''رفعت زیبا ایک پر اعتماد کہانی کار ہیں ۔انہوں نے زندگی کو مطالعے اور مشاہدے سے بڑھ کر دیکھا ہے۔وہ پہلی ملاقات یا پہلی تحریر میں متاثر نہیں کرتیں ان کو زیادہ سے زیادہ دیکھنے اور ان کی تحریروں پر تفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر معنی و مفہوم کے در وا ہوتے ہیں۔''(۹)

ان کی تحریر کا عکس افسانہ ''چاند کا زہر'' ''میری کوکھ تو آج تک بنجر ہے۔ پھر ماتا کے پیار کی لہریں میرے دل میں کیوں امنڈ رہی ہیں۔ میں تو اس جلے ہوئے درخت کی مانند ہوں جس پر کوئی بھی پھول نہیں کھلتا، کبھی کوئی کونپلیں نہیں پھوٹتیں، کبھی بہار نہیں آتی۔ میری جلتی ہوئی ناکام خواہش نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ میرا سر جھک گیا۔ نیلے نیلے پانی میں میرا عکس حقیقت کی طرح میرے سامنے آ گیا۔ میرے بالوں میں چاندی کے تار چمک رہے تھے۔ چہرے پر گزرے دنوں کی سلوٹیں پڑی تھیں اور آنکھوں کے ستارے کہیں ڈوب چکے تھے۔ بڑھاپا دستک دے رہا تھا۔۔۔''

انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو یہاں کے حالات ایسے نہ تھے کہ کوئی عورت کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ انہوں نے بھی دیگر خواتین کی طرح اپنا فرضی نام رکھا۔ فرضی نام رکھنے کی وجہ بھی وہ بتا چکی ہیں۔ ایسا رویہ یہاں عام تھا۔ ان کی ہم عصر خواتین یاسمین صوفی، ڈاکٹر فردوس انور قاضی اور شاہین روحی بخاری تھیں۔ جن کے موضوع بھی عورت کے گرد گھومتے تھے لیکن وہ معاشرتی عوامل کے پس منظر میں جنم لیتے ہیں اور ان کے موضوعات داخلی کیفیات کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت کی روح پیاسی، تڑپتی، شکووں سے بھری اور سماج کے تلخ و سخت رویے کو سامنے لاتی ہے۔ انہوں نے افسانے میں ایک پیغام دیا ہے کہ عورت کو استحصال سے بچایا جائے، انسان کی تذلیل نہ ہو، شرف انسانیت کی اہمیت کا خیال رکھا جائے اور رشتوں کے تقدس کو پامال نہ کیا جائے۔ وہ اس میں کس قدر کامیاب رہیں یہ وقت نے ثابت کر دیا اور آنے والے وقت میں جو افسانے لکھے گئے بلاشبہ ان کے موضوعات بھی اسی ماحول کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں مختلف طرز سے خواتین کے حقوق کی بات ہوئی، فرسودہ رسومات کی بھینٹ چڑھتی انسانیت اور خصوصاً عورت کے مسائل سامنے لائے گئے۔ اس لئے ان کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:

> ''یہ میرے سامنے رفعت زیبا کے تین افسانے رکھے ہیں جو اس نے آج ہی بھیجے ہیں۔ ''گریز، ادھورا چہرہ اور دوسرا مرد'' ہر افسانے کا عنوان ذومعنی مگر مکمل مفہوم کا حامل ہے سوچتی ہوں اس افسانوں پر کیا لکھوں۔۔ مگر کیا؟ سب نے ہی تو افسانوں پر لکھا ہوگا۔ کوئی تو ایسا بھی ہو جو رفعت زیبا کو سوچے۔۔۔ اس پر بھی کچھ لکھے۔۔۔ رفعت زیبا۔۔ جو خود ایک افسانہ۔۔ ایک کہانی ہیں۔۔''(١٠)

ان کی زندگی کے چند پہلو ان کی تحریر میں ملتے ہیں ورنہ امسال کوئی بھی شخص ایسا نہیں مل رہا جو ان کا مطالعہ احوال بتا سکے۔۔ ''چاک گریباں'' مضمون اس کتاب کا حرف آخر ہے۔ جس میں ان کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ والدین بچپن میں مر گئے۔ تین چھوٹے بہن بھائی تھے۔ ساتویں جماعت میں شادی ہوئی تو شادی کی پہلی رات معلوم ہوا کہ اس نے اپنی محبوبہ کو سنگ زنی سے بچانے کے لئے مجھ سے نکاح کیا ہے۔ جب میرے گھر بیٹی پیدا ہوئی تو گھر میں دودھ کی بوند نہ تھی اور میں فکر معاش کے لئے

نکلی۔ ریڈیو پاکستان میں اپنے نانا کے خوف سے فرضی نام سے آغاز کیا جواب تک ہے۔ ان کی اس گفتگو سے ظاہر ہے کہ ایک مرد نے معصوم بچی کے خوابوں کو توڑا ہے۔ اس معصوم بچی کی روح تمام عمر پیاس کے سمندر میں تڑپتی رہی۔ ڈاکٹر فاروق احمد کے مطابق:

''حوا ملزم تھی یا نہیں ؟ یہ تو معلوم نہیں لیکن وہ کس نادیدہ جرم کی سزا بھگت رہی ہے۔ وہ بیس سال کے بن باس کے بعد دوبارہ انسان سے مخاطب ہوتی ہیں اور یہ افسانے ان کی فکری بالغ نظری اور جذبات کے ارتعاش ،احساس کی ندرت میں گندھے ہیں۔ ان افسانوں کی قوت آپ کو ایسی دنیا میں لے جائے گی جہاں اپنے آپ کو دوبارہ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔'' (۱۱)

امرت مراد(۱۹۸۶ء ۔۲۰۱۵ء) کے شعری مجموعہ ''پیاس'' ،افسانوی مجموعہ ''گیلا کاغذ'' ۲۰۱۶ء میں چھپ کر سامنے آئے۔ ''گیلا کاغذ'' کتاب کا انتساب روح کو چھوتا اور ایک سوال چھوڑ کر جاتا ہے۔ ''روٹھی ہوئی ماں کے نام'' ۔ کیا ماں روٹھ سکتی ہے اور روٹھتی ہے تو کیا وہ ماں ہے؟۔ اس سوال کا جواب دینے والی ہستی ہم میں موجود نہیں ہے۔ اس کے افسانے کے موضوع ہماری معاشرت کی تلخ سچائیوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔ وہ اپنے آس پاس سے موضوع اٹھا کر انہیں رشتوں میں پروتی اور پھر ایسی بنت کرتی ہیں کہ قاری یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا کہ وہ افسانہ پڑھ رہا ہے یا حقیقت۔ ابھی تک کسی خاتون کے قلم سے لکھے جانے والے افسانوں میں اس کا شمار منفرد اور حقائق شناس افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے سے وہ مسائل اٹھائے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہ تھے لیکن ان کو زبان نہیں ملی تھی۔ ''بے روزگاری ، رکشہ والے کا اپنے بیٹے کو پالنا اور اس کا باپ کے ساتھ ناروا سلوک ، بم دھماکے میں جان کا جانا اور گڑیا کا سسرالی ظلم کا نشانہ بننا'' ۔ ان میں ''کتے کا بچہ، جلی ہوئی گڑیا، رکشے والہ ،لغڑی اور ایک دونی دونی ،دو دونی چار'' اپنے موضوع اور لکھت کے حوالے سے بہترین افسانے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کہا:

''اس نے ہمارے رسالے ''سنگت'' میں افسانہ بھیجا رے چونک گیا میں ۔ ایسا نیا خیال کہ جھٹکا کھا گیا۔ کبھی کبھی بے جا طوالت اور غیر ضروری تفصیلات کھٹکتی تھیں مگر بالکل نیا اور انوکھا خیال۔ وہ خوب صورت شاعری بھی کرتی تھی، نظم کی شاعری۔ نئے نئے الفاظ لاتی یا بلوچستان میں مستعمل عام الفاظ کو نیا روپ دیتی۔ خیالات حتمی، پرتازہ اور نئے ہوتے۔ مگر کیا ہی ہوتا کہ وہ افسانے ہی لکھتی''۔ (۱۲)

ان کے افسانوں میں اہم کردار نگاری ہے جو رشتوں میں جذبات کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس سے اجنبیت ختم ہو جاتی ہے۔ کرداروں میں دادی ، ماسٹر ،گڑیا، سر ، مالی ، اماں اور باجی ہیں۔ جو کہانی کو آگے لے کر بڑھتے ہیں۔ اس کی افسانہ نگاری میں کامیابی مسائل کی نشاندہی ،طوالت سے دوری

اور مشاہدہ کی گہرائی ہے۔اس کے موضوعات ہمارے معاشرے کی تلخ سچائیاں ہیں ۔ٹرانسپورٹ کے مسائل، بم دھماکہ میں ملنے والی امدادی رقم، امیرزادے کے ہاتھوں لٹنے والی نوکرانی۔ وہ ٢٠٠٠ء کی دہائی میں نمودار ہوئی اور ایک خاتون لکھاری کی حیثیت سے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک منفرد پہچان کی حامل بن گئیں۔ افسانے کو نئے انداز میں ڈھالنے میں جہاں اس کا ذوق اور فکری جہات شامل تھا۔ اس کی مشاہدے کی آنکھ بہت تیز تھی اس لئے اس کے ہاں نئے اور متنوع موضوعات کی کمی نہ تھی۔ افضل مراد کے مطابق:

''ہمارے ماحول میں اکثر دانشور خواتین کا ذکر طنزیہ کیا جاتا ہے۔لیکن امرت واقعی ایک دانش ور خاتون تھی۔ بچوں کے ادب سے آغاز کیا پھر شاعری کی دنیا میں مگن ہوئی، نثری نظموں کا مجموعہ ''پیوندگی زندگی'' دعوت مطالعہ دیتا ہے۔''(١٣)

اس کے افسانوں میں سے چند اقتباس۔ جو افسانے کے فنی محاسن کو اجاگر کرتے ہیں:

''رنگ بھر کر لانے کی مشقت بالکل ایسی ہے جیسے دروازے سے پانی لانے کی کوئی دوشیزہ اپنے ماتھے پر نرم کپڑے کی پٹی باندھے اس پر مشکیزہ کی رسی لٹکا کر دور تک سفر کرتی ہے۔

وقت کو پرندہ کس نے بولا مگر جس نے بولا خوب سوچ سمجھ کر بولا کیوں کہ دانا دنکا چگنے وقت تو اردگرد پھرتا رہتا مگر جب موقع ملے یوں پھر سے اڑ جاتا کہ ایک دم نظروں سے اوجھل۔۔۔

میں کوئی جواب نہ دے پائی۔ سب سوال موچی کی صندوق میں رکھے کیلوں کی طرح میرے دل میں پیوست ہوگئے۔

اسے تو خوشی اور خوشی سے وابستہ چیزیں، باتیں احساسات سب بے معنی لگتے تھے۔''

افسانہ میں شامل کہانی کتاب کی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ قاری کو اس کے کردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ موضوعات کا انتخاب ہمارے سامنے ہی سے کرتی ہیں۔ کوئٹہ کا اہم چوک ''میزان چوک''، جس میں کسی وزن کرانے والی مشین کے مالک کی زندگی کی کہانی، گھاس کاٹنے والے مالی کے مسائل، بے روزگار نوجوان کی حالت زار اور سسرال میں ظلم کا شکار گڑیا ان کرداروں کو اس کی آنکھ نے دیکھا اور کہانی کا روپ دے دیا۔ بلاشبہ سبھی بآسانی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کو کہانی کا حصہ بنانا ایک مشکل کام ہے۔ اور یہ مشکل کام آپ کے قلم سے ہوا۔ ان کہانیوں میں مسائل ہی مسائل نظر آتے ہیں لیکن یاس اور ناامیدی نہیں۔ افسانہ ''گیلا کاغذ میں لکھتی ہیں:

''اس نے سوچا میں بھی سڑک پر پڑا گیلا کاغذ ہوں جو مقدر کی ہوا کے ساتھ منزل

تک اڑا کر نہیں جا سکتا۔ ناکامی کی بارش تھمنے تک اور امید کی ہوا چلنے تک جانے
جانے میں سوکھ کر اڑنے کے قابل ہو سکوں گا یا مٹی کی چادر مجھے خود میں چھپا لے
گی''۔ اور یہ کردار مایوسیت کا شکار ہونے کی بجائے امید کی طرف چلتا ہے۔ یعنی
سوکھ کر اڑنے کی طرف۔''

شاعری میں اس نے نظموں کی طرف توجہ رکھی اور معاشرتی موضوعات کا چناؤ کر کے نظم کو یہاں کے ادب میں بلند آہنگ دیا۔ ابھی اسے بہت کچھ لکھنا تھا، اسے بہت کچھ بولنا تھا، اسے بہت کچھ سمیٹنا تھا، اسے بہت کچھ بتانا تھا لیکن صحت نے اجازت نہ دی۔ آخری ایام میں ذکر درود کرتی رہیں۔ انہوں نے افسانہ ''تحقیقی مقالہ'' لکھنا شروع کیا لیکن ادھورا رہ گیا۔ وہ موزی مرض سرطان میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شوہر افضل مراد نے تصانیف کو شائع کرا کے انہیں ادب میں محفوظ کر دیا۔

دونوں افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا تقابلی جائزہ بتاتا ہے کہ دونوں لکھاریوں کی افسانہ نگاری میں ۳۵ سال کا فاصلہ ہے۔ دونوں نے معاشرے کو گہری نظر سے دیکھا اور سماج کے دکھ و الم کو موضوع بنایا، دونوں کا مشاہدہ تیز ہے۔ دونوں کے موضوعات معاشرے کے بے حد قریب ہیں۔ دونوں نے عورت کی نفسیات کو سامنے رکھا اور اس کی بے بسی پر ماتم تو کیا لیکن اسے کسی امور پر بھی کمزور اور ناتواں پیش نہیں کیا۔ اس کے وقار کو بلند کیا۔ اس کے حقوق کی بات کی۔ اسے معاشرتی شعور سے آگاہ کیا۔ اس فاصلے کو طے کرتے کرتے دونوں کے موضوعات معاشرتی ہونے کے باوجود زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ زمانے کے بدلتے تیور ہیں۔ جدت نے جہاں سکھ دیئے وہاں دکھ بھی ہیں۔ ان خوشیوں اور غموں میں فرق آتا گیا۔ زیبا کے موضوعات میں عورت کا دکھ بے بسی، رسومات سے لڑتی انسانیت اور اس کی آواز کو دباتی صاحب حیثیت کی امارت ہے لیکن اس کے برعکس امرت کے ہاں غربت ہے لیکن رویے میں بہت فرق جبکہ یہاں اسی غربت کا پرچار، قربانی، بے روزگاری، سرد رویہ، دہشت گردی اور اس کے اثرات میں ملتا ہے۔ دونوں کے ہاں رجحانات اپنی اپنی معاشرت کے مطابق ابھرتے ہیں۔ دونوں کے ہاں گہرا مشاہدہ اور تصویر کشی کا وصف ہے۔ دونوں ہی اس بات پر مماثلث رکھتی ہیں کہ انہوں نے سماجی تلخیوں، کردار نگاری کو پروان چڑھایا اور افسانے لکھنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ اب تعلیم نے آگاہی عطا کر دی ہے پہلے تعلیم کی کمی اور غلامی کی فضا عام تھی۔ البتہ دونوں کے ہاں داخلی اور خارجی دکھ یکساں اور زیادہ نظر آتا ہے۔ یہاں کی اردو ادب کی نثری تاریخ میں دونوں کی افسانہ نگاری نے جو اثرات مرتب کیے ان کی وجہ سے ذخیرہ الفاظ اور نو لفظیات میں اضافہ ہوا اور افسانے کی روایت کو فروغ ملا۔

حوالہ جات

۱۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان وادب، کوئٹہ: شعبہ اردو، جامعہ بلوچستان، ۱۹۹۸ء، ص:۱۸۳، ک ص:۲۵۵

۲۔ رفعت زیبا، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص:۶

۳۔ کوثر زمرد حسین، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص۱۶، ک ص:۲۴۰

۴۔ حکیم بلوچ، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص:۲۴

۵۔ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص:۲۸

۶۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان وادب، ص:۲۵۶

۷۔ مبارکہ حمید، مسز، مقالہ: ایم۔فل، بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

۸۔ کوثر زمرد حسین، میرے زخم بکتے ہیں، ص:۱۹

۹۔ افضل مراد، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص:۳۲

۱۰۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، میرے زخم بکتے ہیں، لاہور: یونٹی پرنٹر، ۲۰۰۳ء، ص:۴۰

۱۱۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان وادب، ص:

۱۲۔ شاہ محمد مری، گیلا کاغذ، مہر در، کوئٹہ: انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، ۲۰۱۶ء، ک ص:۱۱۲

۱۳۔ افضل مراد، میرے زخم بکتے ہیں، ص:

☆......☆......☆